



ماہنامہ

# الفلاح

AL-FALAH

February 2020

ALFALAH YOUTH  
FORUM



0307-0559827

فروری ۲۰۲۱

گل کے واسطے نیک عمل کر لو، اے نادان!

دارثوں پر بھروسہ؟ جو آج اپنا آپ بھولائے بیٹھے ہیں۔



# فہرست

03

04

10

مقصدِ حیات

عرفان خان کا خط

علامہ اقبال (شاعری)

مدیر: عثمان علی

رسالہ فی سبیل اللہ حاصل کرنے  
لیے درج ذیل نمبر پر میسج کریں۔  
0307-0559827

join us on  
Facebook:



www.facebook.com/  
Alfalahyouthforum

join us on  
YouTube:



Alfalah Youth Forum

join us on  
Whatsapp:



[ Name Join Alfalah ] SMS to  
0302-7396939

(for example)

[ Usman Join Alfalah ] SMS to 0302-7396939



## مقصدِ حیات

آخرت کی فکر کر لے، لے انسان!  
زندگی کا کیا بھروسہ کہاں ساتھ چھوڑ جائے

ہم انسان بھی نہ سب کچھ سمجھتے ہیں، جانتے ہیں، لیکن پھر بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے دنیا کی رنگینیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ خدا کو بھول جاتے ہیں، خدا کے احکامات کو بھول جاتے ہیں، اپنی زندگی کا مقصد بھول جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک دن مرنا ہے، آنکھوں سے لوگوں کو مرتا دیکھتے ہیں، کانوں سے اموات کے اعلانات سنتے ہیں، ہاتھوں سے ناجانے کتنے لوگوں کو دفنا بھی دیتے ہیں، لیکن پھر بھی شاید ہمیں موت کا یقین نہیں ہے، کیونکہ موت کا یقین اپنے رب کے حضور پیشی کا یقین تو افکار بدل دیتا ہے، کردار بدل دیتا ہے۔ ہماری فکر کی تو کیا ہی بات ہے عالیشان مکان سے شروع ہوتی ہے تو نیو ماڈل گاڑی پر ختم، سونے کے زیورات سے شروع ہوتی ہے تو بہترین لباس پر ختم، اب یہ بھی نہیں کہ ان چیزوں کو حاصل نہ کریں، حاصل کریں لیکن مقصدِ حیات نہ بنائیں۔

مقصدِ حیات خدا کی ذات کا عرفان ہونا چاہیے، خدا کی عبادت ہونی چاہیے۔ اب یہاں ایک اور بات: عبادت لفظ میں بہت وسعت ہے، عبادت سے مراد صرف نماز نہیں، صرف حج نہیں، عبادت سے مراد ہر کام خدائے واحد کے احکامات کے مطابق کرنا ہے۔

## عرفان کا خط

[یہ آرٹیکل ابوبیکہ صاحب نے عرفان خان کی موت سے پہلے لکھا تھا۔]

عرفان خان بین الاقوامی شہرت کے حامل ایک انڈین ایکٹر ہیں۔ ان کا شمار بالی وڈ کے بہترین اداکاروں میں کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل انھیں کینسر کی ایک شاذ قسم تشخیص ہوئی۔ حال ہی میں انھوں نے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہونے والے ایک خط میں اپنی اس بیماری کا انکشاف کیا۔ ساتھ ہی بڑی خوبصورتی سے ان احساسات کی ترجمانی کی جو زندگی میں عین عروج کے وقت موت کی اچانک آہٹ ملنے پر کسی انسان میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہ خط برصغیر اور پوری دنیا میں موجود ان کے کروڑوں مداحوں میں پھیل گیا۔ میں نے اس خط کو بار بار پڑھا ہے۔ انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی۔ یہ بڑا موثر خط ہے۔ یہ خط بظاہر عرفان خان نے دنیا بھر میں موجود اپنے کروڑوں چاہنے والوں کو لکھا ہے، مگر میرے نزدیک اس خط کے دو پہلو اور ہیں جو بین السطور موجود ہیں اور جن کا سمجھنا ضروری ہے۔

پہلا یہ کہ یہ خط خدا نے ان کے ذریعے سے پوری انسانیت کو لکھوایا ہے۔ اس خط کے ذریعے سے ہر انسان کو خدا کا یہ پیغام پہنچ جانا چاہیے کہ انسان اپنا ہر مسئلہ حل کر سکتا ہے، موت کا مسئلہ حل نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ موت خدا کے حضور پیشی کا نام ہے۔ یہ عارضی دنیا سے نکل کر ابدی دنیا میں چلے جانے کا نام ہے۔ یہ انسانی دنیا سے نکل کر خدائی دنیا میں حاضری کا نام ہے۔ یہ پرچہ امتحان حل کر کے نتیجہ امتحان سننے کا مرحلہ ہے۔ یہ انسان کے خاتمے کا نہیں امتحان کے خاتمے کا مرحلہ ہے۔

یہ موت ہر انسان کو آنی ہے مگر عام حالات میں لوگ اس سب سے بڑی حقیقت سے پہلو تہی کیے رہتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی معروف شخصیات کے ساتھ پیش آنے والے ایسے واقعات باقی لوگوں کو اس عظیم حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔



انسانیت کے علاوہ اس خط کے دوسرے مخاطب مسلمان ہیں۔ مسلمان ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا کے وارث ہیں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ انبیا کے اصل مشن یعنی آخرت کے انداز اور یاد دہانی کو زندہ رکھیں۔ مگر مسلمان اس کام کو چھوڑ کر دوسرے کاموں میں مصروف ہیں۔ حتیٰ کہ ایک مسلمان عرفان خان کے خط سے بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ موت کو ابدی زندگی کا آغاز سمجھتا ہے۔

مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری سے یہ غفلت ایک انتہائی سنگین جرم ہے۔ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ اس کی سزا کے طور پر دنیا بھر کے مسلمانوں پر ذلت، مسکنت اور مغلوبیت مسلط کر دی گئی ہے۔ مگر مسلمان اپنے اس جرم کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ وہ انسانیت تک خدا کا پیغام پہنچانے پر تیار نہیں۔ ان کا اصل مسئلہ دنیا کا غلبہ اور اقتدار ہے۔ بالکل فلمی اداکار عرفان خان کی طرح جس کا سب سے بڑا مسئلہ دنیا تھی اور جس دنیا سے رخصتی کے اعلان نے اس کو توڑ کر رکھ دیا۔

آج کا مسلمان بھی اسی دنیا کے لیے جیتا اور مرتا ہے۔ مسلمانوں کی قیادت اسی دنیا کے غلبے اور اقتدار کو سب سے بڑا مسئلہ بنائے ہوئے ہے۔ جبکہ خدا کی اسکیم میں یہ دنیا ایک امتحان، ایک عارضی قیام گاہ اور ایک متاع حقیر کے سوا کچھ نہیں۔ عرفان خان کا یہ خط دنیا بھر کے ان مسلمانوں کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی سطح پر دنیا ہی کو اصل مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ مگر جب موت سامنے آئے گی، جب ڈاکٹر جواب دے دیں گے، جب ہم اپنے اپنے حصے کے کینسر کی خبر سنیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہ تھی۔

فرد کا معاملہ تو پھر اسی روز طے ہو گا جب اصل زندگی شروع ہوگی۔ مگر مسلمانوں کا اجتماعی معاملہ آج ہی طے ہو چکا ہے۔ ان پر اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی کے جرم میں ذلت، مغلوبیت اور رسوائی مسلط کی جا چکی ہے۔ وہ لاکھ کوشش کر لیں، ذلت کی یہ رات ان پر سے ختم نہیں کی جائے گی جب تک کہ وہ دنیا تک آخرت کا پیغام پہنچانا اور آخرت کا انداز کرنا اپنا اصل مقصد نہیں بنا لیتے۔

## عرفان خان کا تحریر کردہ خط

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تمہاری آنکھ اس جھٹکے سے کھلتی ہے جو زندگی تمہیں جگانے کو دیتی ہے، تم ہڑبڑا کے اٹھ جاتے ہو۔ پچھلے پندرہ دنوں سے میری زندگی ایک سسپنس والی کہانی بنی ہوئی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ انوکھی کہانیوں کا پیچھا کرتے کرتے میں خود ایک انوکھی بیماری کے پنجوں میں پھنس جاؤں گا۔ ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی مجھے اپنے نیوروائنڈوکرائن (آنتوں سے متعلق) کینسر کے بارے میں پتا چلا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کے مریض پوری دنیا میں بہت ہی کم ہیں، نہ ہونے کے برابر۔ مریض نہیں ہیں تو اس پہ تحقیق بھی ویسے نہیں ہوئی جیسے ہونی چاہیے تھی۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ ڈاکٹروں کے پاس دوسری بیماریوں کی نسبت اس کے بارے میں کم معلومات ہیں، علاج کامیاب ہوگا یا نہیں، یہ بھی سب ہوا میں ہے، اور میں..... میں بس دواؤں اور تجربوں کے کھیل کا ایک حصہ ہوں۔

یہ میرا کھیل نہیں تھا بھائی، میں تو ایک فل سپیڈ والی بلٹ ٹرین میں سوار تھا، میرے تو خواب تھے، کچھ کام تھے جو کرنے تھے، کچھ خواہشیں تھیں، کچھ ٹارگٹ تھے، کچھ تمنائیں تھیں، آرزوئیں تھیں، اور میں بالکل ان کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ اب کیا ہوتا ہے کہ اچانک پیچھے سے کوئی آکر میرے کندھا تھپتھپاتا ہے، میں جو مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ ٹکٹ چیکر ہے؛ ”تمہارا سٹاپ آنے والا ہے بابو، چلو اب نیچے اترؤ“۔ میں ایک دم پریشان ہو جاتا ہوں؛ ”نہیں نہیں بھائی میاں، میری منزل ابھی دور ہے یار“۔ اور پھر ٹکٹ چیکر مجھے سمجھانے والے انداز میں کہتا ہے؛ ”نہ، یہی ہے، سٹاپ تو بس یہی ہے، ہو جاتا ہے، کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے“۔



اس اچانک پن میں پھنس کے مجھے سمجھ آ گئی کہ ہم سب کس طرح سمندر کی بے رحم لہروں کے اوپر تیرتے ایک چھوٹے سے لکڑی کے ٹکڑے کی طرح ہیں۔ بے یقینی کی ہر بڑی لہر کے آگے ہم تو بس اپنے چھوٹے سے وجود کو سنبھالنے میں لگے رہتے ہیں۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ ہر سمندر گوپی چندر، بول میری مچھلی، کتنا پانی، اتنا پانی! تو بس پانی، بے رحم پانی، وقت کی موجوں کے تھپیڑوں میں تیرتی نامعلوم ہستی اور پانی!

اس مصیبت میں پھنسنے کے بعد ایک دن جب میں ڈراسہا ہوا ہسپتال جا رہا تھا تو میں نے اپنے بیٹے سے ایویں بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ مجھے اس وقت اپنے آپ سے کچھ نہیں چاہئے، ہاں بس اتنا ضرور ہے کہ یا اس عذاب سے میں اس طرح نہ گزروں جیسے اب اس وقت گزر رہا ہوں۔ مجھے اپنا سکون اپنا اطمینان واپس چاہیے۔ یہ جو ڈر، جو خوف، جو پریشانیاں میرے کندھوں پہ چڑھی بیٹھی ہیں میں انھیں اٹھا کے پھینک دینا چاہتا ہوں، میں ایسی قابل رحم قسم کی ہونق حالت میں اب مزید نہیں رہنا چاہتا۔ اس بیماری کا شکار ہونے کے بعد میری واحد خواہش یہی تھی۔ اور پھر اپنی تکلیف کی طرف میرا دھیان چلا گیا۔ مطلب اتنے عرصے سے میں بس اپنی تکلیف جھیل رہا تھا، برداشت کر رہا تھا، درد کی شدت کا احساس کر رہا تھا، لیکن اس پوری مدت میں کوئی بھی چیز اسے ختم نہیں کر پا رہی تھی۔ کوئی ہمدردی، پیار بھرے بول، کوئی ہمت بندھانے والی بات، کچھ بھی نہیں! اس وقت پتا ہے کیسا لگتا تھا؟ جیسے پوری کائنات صرف ایک چیز کا روپ دھار چکی ہے، درد، خوفناک درد۔ وہ درد جو ہر چیز سے بڑا ہے!

ہر چیز سے مایوس ہو کر تھکا ہارا، بے حال جب میں ہسپتال کے اندر داخل ہو رہا تھا تو سامنے کی طرف میری نظر پڑی۔ ادھر لارڈز کرکٹ گراؤنڈ تھا۔ وہ لارڈز جسے دیکھنا میرے بچپن کی سب سے بڑی حسرت تھا۔ اور اب اس تکلیف کے دوران وہاں لگاویوین رچرڈز کا ایک بڑا سا ہنستا ہوا پوسٹر بھی مجھے اپنی طرف کھینچ نہیں سکا۔ دنیا تو جیسے اب میرے کام کی رہ ہی نہیں گئی تھی۔

خیر، اس ہسپتال میں ایک کو مار ڈیا بھی تھا، وہ سارے مریض جو لمبے عرصے کے لیے ہوش اور بے ہوشی بلکہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکے ہوتے تھے، وہ ادھر رکھے جاتے تھے، اوپر، بالکل میرے وارڈ کے اوپر والے کمرے میں۔

ایک دن میں اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا تھا تو جیسے ایک جھماکا ہوا۔ گیم آف لائف اور گیم آف ڈیٹھ کے بیچ میں ہے کیا؟ ایک سڑک؟ (کرکٹ کو گیم آف لائف بھی کہتے ہیں) ایک طرف ایک ہسپتال ہے اور اس کے بالکل سامنے دوسری طرف ایک سٹیڈیم، اور دونوں میں کھیلے جانے والے کھیل کی ایک چیز کا من ہے، بے یقینی۔ نہ لارڈز سٹیڈیم میں پتہ ہے کہ اگلی گیند پہ کیا ہوگا، نہ ہسپتال میں اگلی سانس کا پتہ ہے۔ کامل بے یقینی۔ یہ فیلنگ جیسے میرے اندر اتر گئی۔

اب مجھے کائنات کی وسعت، اس کی طاقت اور اس کا نظام، سب کچھ کہیں نہ کہیں سمجھ آنا شروع ہو گئے تھے۔ آخر میرا ہسپتال ایک کھیل کے میدان کے سامنے کیوں تھا؟ اور صرف میں نے ہی اس بات کو اتنی شدت سے محسوس کیوں کیا؟ یہ سب مجھے آپس میں جڑا ہوا لگنے لگا۔ تو سمجھو کہ بس جو چیز یقینی ہے وہ بے یقینی ہے۔ یعنی بے یقینی کے علاوہ اس پوری کائنات میں کچھ بھی ایسا نہیں جسے یقینی کہا جاسکے۔

اب جب سبھی بے یقینی کے بہاؤ میں ہیں تو میں کیا اور میری بے یقینی کیا؟ مجھے تو بس اپنی باقی رہ جانے والی طاقت کو سنبھالنا ہے اور اپنے حصے کا کھیل اچھے سے کھیلنا ہے، دیٹس اٹ! تو بس اس ایک لمحے کے بعد مجھے سمجھ آ گئی۔ میں جان گیا کہ نتیجہ جو بھی نکلے مجھے اس حقیقت کو ماننا ہوگا۔ ادھر سب کچھ ایسا ہی ہے۔ چاہے میرے پاس آٹھ مہینے بچے ہیں، چاہے دو ماہ یا بے شک دو مزید سال، سب کچھ ایک طوفانی لہر میں ہے۔ اس کے بعد تمام خدشے، تمام ڈر، تمام خوف، تمام پریشانیاں سب کچھ دھندلے ہوتے گئے اور میرا دماغ ان سب سے خالی ہو گیا۔



ساری عمر میں پہلی بار تب مجھے اندازہ ہوا کہ آزادی کا مطلب واقعی میں ہے کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے مجھے کوئی بڑی کامیابی ملی ہے۔ جیسے زندگی کا جادو بھرا ذائقہ مجھے پہلی بار چکھنے کو ملا ہے اور یہ سب میرے جسم کی ایک ایک پور میں اتر چکا تھا۔ اس پوری بیماری کے دوران لوگ میرے لیے دعائیں کرتے رہے ہیں، لوگ جنہیں میں جانتا ہوں، لوگ جنہیں میں نہیں بھی جانتا، وہ سب مختلف جگہوں پہ، مختلف ٹائم زونز میں رہتے ہوئے میرے لیے دعائیں کرتے رہے اور مجھے لگا کہ ان کی سب دعائیں مل کے ایک ہو گئیں۔

ایک بڑی سی طاقت، جیسے ایک لہر کی، بڑی سی موج کی طاقت ہوتی ہے، وہ بس ریڑھ کی ہڈی سے میرے اندر تک اتر گئی اور میری کھوپڑی کے اندر اس نے اپنی جڑیں بنالیں۔ اب وہ ادھر اگتی رہتی ہے، کبھی ایک چھوٹا سا امید کا پودا، کبھی ایک پتا، کبھی ایک نرم سا تنا۔ میں اسے دیکھتا ہوں اور خوش ہوتا رہتا ہوں۔ اتنی ساری دعاؤں کے نتیجے میں اس پہ جو بھی پھول اگتا ہے، جو بھی نئی ٹہنی نکلتی ہے، جو بھی پتا آتا ہے، وہ مجھے صرف خوشگوار سی حیرت اور خوشیاں دیتا ہے۔ تو وہ جو لکڑی کا ننھا سا ٹکڑا ہے نا، اسے کیا ضرورت کہ وہ پانی کے بہاؤ کا رخ بدلنے کی کوشش کرے؟ اسے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ہم سب قدرت کی گود میں بیٹھے ہیں جو ہمیں ہلکے پھلکے جھولے دے رہی ہے، نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کچھ بھی کم، دیٹس اٹ۔“

[ مترجم حسنین جمال، بشکر یہ [www.humsub.com.pk](http://www.humsub.com.pk) ]

اس حسین دنیا میں خدا کو بھول کر جینا سب سے بڑا جرم  
اور اس رنگین دنیا میں اُسے نہ بھولنا سب سے بڑی نیکی ہے،  
جہنم اسی جرم کی سزا ہے اور جنت اسی نیکی کی جزا ہے۔



## علامہ اقبال

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری  
اے کشتہء سلطانی و ملائی و پیری

اے مرد مسلمان کبھی تیرا ضمیر آئینے کی طرح ہوتا تھا اور  
تو اس میں اچھائی اور برائی کے فرق کو دیکھ کر ہمیشہ برائی  
سے بچا ہوا اور اچھائی پر مائل رہتا تھا لیکن اب یہ قوت جو  
تجھے برائی پر ٹوٹے اور نیکی کی طرف تیرا رجوع رکھے تم میں  
موجود نہیں ہے اور اس بنا پر تو نیکی اور اچھائی کو چھوڑ کر  
بدی اور برائی کی طرف مائل رہتا ہے۔ اگر تیرا ضمیر زندہ  
ہوتا تو پھر تو بادشاہ، ملا (نام نہاد ملا) اور پیر (نام نہاد پیر)  
کا مارا ہوا اور ان کے فریب میں گرفتار نہ ہوتا۔ تجھے معلوم  
ہوتا کہ اصل شاہی، اصل ملائی اور اصل پیری کیا ہے۔ تو ان  
کے فریب میں آنے کی بجائے ان کا احتساب کرتا۔ خلق خدا  
کو لوٹنے والے ان جعل سازوں، پیشہ وروں اور جابروں سے  
خود بھی بچتا اور دوسروں کو بھی بچاتا۔ (شرح اسرارِ زیدی)



# الفلاح یوتھ فورم

## قیام کے مقاصد

- ★ مقدس اوراق کے لیے محفوظ جگہ فراہم کرنا
- ★ فقہی مسائل سے آگاہی
- ★ نوجوان نسل میں تعمیری اور فلاحی کاموں کے لیے شعور کی بیداری
- ★ نوجوانوں کو صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع کی فراہمی
- ★ معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا تحفظ
- ★ نوجوان نسل میں اتحاد اور ہم آہنگی کا فروغ
- ★ طلباء کے لیے اکیڈمیز کا قیام
- ★ کھیلوں کے مقابلوں کا انعقاد
- ★ عطیہ خون

ہم نے صرف سوچنے کا انداز بدلنا ہے، زندگیاں خود ہی بدل جائیں گی۔